www.rahimia.org

شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

ماہنامہ رحیمیہ لاہور

بانی: حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوریؒ

قدس اللّٰہ سِرّہٗ السّعید مسند نشین رابع خانقاہ عالیہ رحیمیہ رائے پور

مدیرِ اعلیٰ: حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

جانشین حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ

مجلس ادارت

سرپرست: ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

صدر: مفتی عبدالمتین نعمانی

مدیر: محمد عباس شاد

نومبر 2016ء / صفر المظفر 1438ھ جلد نمبر 8، شمارہ نمبر 11 - قیمت: 20 روپے سالانہ ممبر شپ: 200 روپے - تین سالہ ممبر شپ: 500 روپے

ارشادِ گرامی

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ
مسند نشین ثانی
خانقاہ عالیہ رحیمیہ رائے پور

فرمایا:

”سنو! جب تک خلافت میں یہ بات رہی کہ وہ صفتِ احسان سے متصف رہے، اس وقت تک بیعت نہ تھی مگر خلافت کی۔ البتہ صحبت تھی۔ انبیاؑ کا آنا بھی اسی لیے تھا کہ صحبت کے بغیر اَخلاق کی اصلاح نہیں ہوتی۔

نبیؑ صرف لڑنے بھڑنے کے لیے نہیں آیا کرتے۔ وہ تو لوگوں کی اخلاقی تربیت اور روحانی ترقی کے لیے آتے اور تبلیغ کرتے ہیں، مگر یہ سب کام کمال کو آسانی سے تبھی پہنچ سکتے ہیں کہ امن ہو اور موانع رفع (رُکاوٹیں دور) کیے جائیں۔ اس لیے سلطنت کی ضرورت پیش آتی ہے۔“

(مجلس: 17 / رمضان المبارک 1365ھ / 15 / اگست 1946ء۔ مقام: رائے پور)

(ارشادات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ص: 153۔ طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

فہرست مضامین

- میاں بیوی اور حاکم و رعایا کا تعلق
- عقل و شعور کی اہمیت
- جنگیں، استعمار اور حکمران
- شریعتِ الٰہی کا مقصد؛ انسانی ظلم اور جہالت کا خاتمہ
- تربیت کے فطری اصول
- ٹیکس اور نظام کا زوال
- شنگھائی تعاون تنظیم اور پاکستان
- جمعہ؛ اجتماعیت کا ایک اہم نمونہ
- امامتِ صغریٰ اور امامتِ کبریٰ
- قیادت کی صلاحیت اور معیار
- بادشاہت اور جمہوریت
- پُراثر تحریر لکھنے کے اصول
- شجاعت اور بہادری کی نادر حکایت
- حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ
- جانشین خانقاہِ سراجیہ کی ادارہ رحیمیہ آمد
- ارشادات حضرت رائے پوری رابعؒ
- دینی مسائل

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
0092-42-36307714,36369089-www.rahimia.org
Email: info@rahimia.org

رحیمیہ کا انگلش ایڈیشن ہماری ویب سائٹ پر پڑھا جاسکتا ہے۔

رقومات کی ترسیل بنام ”ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ ٹرسٹ لاہور“ اکاؤنٹ نمبر 0010030341820010 الائیڈ بینک مزنگ چونگی برانچ لاہور، برانچ کوڈ 0533

www.rahimia.org

درسِ قرآن

تفسیر: امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ

میاں بیوی اور حاکم رعایا کا تعلق

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (228:2)

(اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک، اور ان کو حلال نہیں کہ چھپا رکھیں، جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں، اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر۔ اور ان کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا، اس مدت میں اگر چاہیں سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق، اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔ اور اللہ زبردست تدبیر والا ہے۔)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے آخر کا ترجمہ شروع میں کیا جائے، تاکہ مطلب واضح ہو جائے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠: اور ان کو منصفانہ طریقے پر ایک دوسرے کے خلاف مساوی حقوق حاصل ہیں، یعنی مرد اور عورت کے لیے خانہ داری سے متعلق، یعنی گھر کے داخلی اُمور میں دونوں کے لیے مساویانہ حقوق ہیں۔

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ: اور مردوں کا درجہ تھوڑا سا بلند ہے، یعنی گھر سے باہر کے خارجی اُمور میں مرد کو تھوڑا سا تفوق ہے۔

اب حکومت سے متعلق اس آیت کی تفسیر کیجیے!

لوگوں نے آپس کے صلاح و مشورے سے ایک بہترین آدمی کا (بہ طورِ حکمران) انتخاب کیا۔ ملکی داخلی معاملات میں ان تمام کے حقوق مساوی ہیں، مگر حاکم کو حاکمانہ طریقے پر تھوڑا سا تفوق ہوگا کہ وہ خارجہ پالیسی میں (ملک کی نمائندگی کرنے کے حوالے سے) ان سے ذرا بلند درجہ رکھے گا۔ حاکم صلاح مشورے کے لیے ہر ایک آدمی کا دست نگر ہوگا۔ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہو جائے اور حاکم الگ ہو جائے تو حاکم کو ایک وقفے تک نظرثانی کی اجازت ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ اسی طرح الگ ہو گئے تو ان کا گھر، یعنی قومی حکومت بہت جلد تباہ ہو جائے گی اور ان کی ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اگر دونوں فریق ملنا چاہیں تو ان کو اجازت ہے کہ وہ آپس میں صلح و آشتی سے دوبارہ متحد ہو جائیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ میاں بیوی کا تعلق قابلِ انقطاع ہے، یعنی دونوں تباہی سے بچنے کی خاطر ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں۔ ہندوؤں یا دوسرے مذاہب کی مانند غیر قابلِ انقطاع نہیں، بعینہٖ حکومت کا یہی حال ہے کہ اگر حاکم ناقابل قبول ہو تو اُسے منصب سے علاحدہ کر دینا ضروری ہے اور اس کا حق موروثی نہ سمجھا جائے، بلکہ اسے بھی اسی طرح قابلِ انقطاع تصور کیا جائے۔ (تفسیر المقام المحمود، ص: 382)

درسِ حدیث

تشریح: مولانا ڈاکٹر محمد ناصر، جھنگ

عقل و شعور کی اہمیت

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول ﷺ: "انّ الرّجل لیکون من أهل الصّلوٰة، والصّوم، و الزّکوٰة، والحجّ، والعمرة." حتّیٰ ذکر سهام الخیر کلّها، "وما یجزی یوم القیمٰة إلّا بقدر عقله." (مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر 5065)

(حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''آدمی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ کرنے والوں میں سے ہوتا ہے۔'' یہاں تک کہ حضورؐ نے بھلائی کے تمام کاموں کا تذکرہ کیا۔ پھر فرمایا: ''قیامت کے دن اُسے اُس کی عقل کے بہ قدر ہی بدلہ دیا جائے گا۔'')

یہ حدیث اس اَمر کو واضح کرتی ہے کہ تمام عبادات کا اَجر و ثواب اور بدلہ انسان کے اپنے عقل و شعور کو استعمال کرنے کے بہ قدر ہی ملتا ہے۔ محض دیکھا دیکھی یا مرعوبانہ سوچ کے تحت کی ہوئی عبادت زیادہ نتائج نہیں دیتی۔ عبادت گزار کو چاہیے کہ وہ اس بات پر کڑی نظر رکھے کہ عبادت کے انفرادی اور اجتماعی نتائج حاصل ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ہو تو ان اسباب کا جائزہ لے کر ان کا حل تلاش کرنا' ایک عبادت گزار کی ذمہ داری ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے کہ ہمارا کام تو صرف عبادت کرنا ہے، نتیجہ آئے یا نہ آئے۔ فرض کی ادائیگی کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے، لیکن دین کا یہ مکمل شعور نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عبادت کے فرد اور معاشرے پر مرتب ہونے والے اَثرات کا فہم پیدا کر کے عبادت کو اختیار کرنے کے نتائج لامحدود ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے صوفیائے کرام کے ہاں نیت کو ذہن میں حاضر رکھنے کا خیال و دھیان پختہ کرایا جاتا ہے۔ تمام ادیان میں عبادت سے مقصود دو ہی چیزیں رہی ہیں: 1۔ فرد کے فکر و عمل پر مثبت اَثرات مرتب ہوں۔ 2۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے معاشرے پر اَثرات اس طرح مرتب ہوں کہ عبادت، عدل و انصاف، مساوات اور اعلیٰ اخلاقیات کے قیام کا باعث بن جائے۔ تمام ادیان میں ان امور پر زور دیا گیا ہے۔

عبادت کے اس شعوری اِدراک کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ توجہ سے کیا ہوا عمل آخرت میں قبولیت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس سے معاشرتی مسائل کے حل کی راہ نکلتی ہے۔ محض عادت کے طور پر کی ہوئی عبادت یہ دونوں نتائج مرتب کرنے میں خام رہتی ہے۔ چناں چہ نماز فاسد معاشرے کے خاتمے، روزہ خواہشاتِ نفسانی کو کنٹرول رکھنے، صدقات و اِنفاق اِکتناز و اِحتکار کی روک تھام اور حج شعائرِ دین کے بین الاقوامی غلبے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان مقاصد کو سمجھ کر اور ان کے حصول کی تمنا اور کوشش کے ساتھ جب عبادت اختیار کی جائے تو پھر عبادت معاشرتی تبدیلی کی ایک تحریک بن سکتی ہے۔ ورنہ جیسے جیسے انسان محض انفرادی عبادت میں منہمک ہوتا ہے ویسے ویسے معاشرتی ذمہ داریوں سے بے زار اور گریزاں ہوتا جاتا ہے۔ یہ روش امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ابدی حکم سے روگردانی کا سبب بن جاتی ہے جو مؤمنانہ زندگی کی موت ہے۔

www.rahimia.org

جنگیں، استعمار اور حکمران

قوموں پر جنگیں مسلط کر کے انھیں ترقی، امن اور خوش حالی سے محروم رکھنا عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا استعماری حربہ ہے۔ اس نے ماضی میں بھی اپنی جنگی حکمتِ عملی سے جہاں قوموں اور ملکوں کو تباہ کیا، وہاں خود اسلحے کی بھاری صنعتیں لگا کر اُس کی تجارت سے اربوں ڈالر کمائے۔ اُس نے ہمیشہ کسی بھی خطے کے دو پس ماندہ ملکوں کے درمیان تضادات اور جنگی فضا کو ہوا دے کر اپنی اسلحے کی تجارت کو فروغ دیا۔ اُس نے ہمیشہ اپنی جنگیں بھی اپنے ملکوں سے باہر لڑیں۔ یوں اُس نے اپنی جنگوں کے لیے بھی ہمیشہ ایشیا اور افریقا کے ممالک کو میدانِ جنگ بنا کر موت اور تباہی کے بازار سجائے۔ آج بھی جنگی ساز و سامان کی صنعتیں، بازار، گودام اور حکمتِ عملی سامراج کے قبضے میں ہے۔ جنگِ عظیم اوّل، دوم سمیت ویت نام، لبنان، افغانستان، عراق، شام، لیبیا اور فلسطین کی خانہ جنگیوں کے پس پشت عالمی سرمایہ دارانہ نظام ہی کی دلچسپی رہی ہے۔

گزشتہ دنوں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بھی حسبِ روایت جنگی عزائم پر مشتمل تقریر، تحریر اور بیان بازی کی خوب فضا رہی۔ جس کے آثار تا حال سرحدوں کے دونوں طرف بعض حصوں پر نمایاں ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان جب بھی کبھی ایسی فضا بنتی ہے تو دونوں طرف کی فرقہ پرست قیادتیں اور میڈیا خوب عوامی جذبات کو گرماتے ہیں۔ نام نہاد مذہبی اور سیاسی قیادتیں اپنے ووٹ بینک کو بڑھانے اور مقبولیت کو قائم رکھنے کے لیے اور میڈیا اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے جنگی نفرت اور مذہبی تعصّبات کو خوب بیچتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ المیہ تقسیم کے دور کی یادگار ہے کہ وسائل اور میڈیا پر قابض طبقے اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے جنگیں، جلسوں کی تقریریں اور اخبارات کے بیانات کی صورت میں ہی لڑتے آئے ہیں۔ تاریخ میں دونوں طرف کے فرقہ پرست اخبارات کی فائلوں میں ایسی ایسی سرخیاں محفوظ ہیں کہ جن کی روشنی میں اگر تاریخ لکھی جائے تو یوں معلوم پڑتا ہے کہ یہ خطہ نہ جانے کتنی ہول ناک اور خوف ناک جنگوں کو عبور کر کے یہاں پہنچا ہے۔ ایسے ہی آج بھی اخباروں، جلسوں، میڈیا اور سوشل میڈیا پر لڑی جانے والی جنگ میں ایک طبقہ اپنے کاروبار اور بزنس کو فروغ دے رہا ہے۔

حال آں کہ دونوں جانب کی یہ قوتیں عوامی مسائل سے توجہ ہٹا کر اُن کے جذباتی استحصال کے بجائے، ان وسائل کو دونوں جانب کے غریب اور پس ماندہ آبادیوں کو تعلیم اور خوش حالی سے آراستہ کرنے کے لیے بھی صَرف کر سکتے ہیں۔ آج کی انسانی دانش جنگوں کی طویل تاریخ کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جنگیں مسائل کا حل نہیں، بلکہ مسائل کی وجہ ہوتی ہیں۔ اسی لیے آج باشعور قومیں اپنے تنازعات کو جنگوں، تشدد اور اسلحے کے بل بوتے پر نہیں، بلکہ ٹیبل ٹاک، مذاکرات اور باہمی میل جول کے راستے دریافت کر کے حل کرتی ہیں۔

ان جنگوں کے ملبے تلے انسانی روحیں اور چاند سے چہرے دب جاتے ہیں۔ حاکم جنگ کے منہ میں انسانی لاشوں کے ترنوالے دے کر مذاکرات کی میز تک پہنچتے ہیں۔ قبروں کے شکم مرمریں پیکروں سے بھرے جاتے ہیں۔ جنگوں میں روشنیاں دبے پاؤں انسانی آبادیوں سے نکل جاتی ہیں اور اندھیرے بھوک و افلاس کی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ آ ڈیرے جماتے ہیں۔ جنگیں عقلوں کے مینار مسمار، دماغوں کے پھول اور دلوں کی بستیوں کو اُجاڑ اور روحوں کو نگل جاتی ہیں۔ اسی جنگ ہی کا انجام ہوتا ہے کہ انسانی آبادیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھتے ہیں۔ اس کے کھنڈرات پر زندگی رینگتی اور موت دوڑتی ہے۔ یہاں زندگی سہمے کھڑی ہوتی ہے اور موت رقص کرتی ہے۔

جی ہاں! جنگ اسے ہی تو کہتے ہیں، جہاں زندگیاں سستی، پھول اور کفن مہنگے ہوتے ہیں۔ جہاں قبرستان آباد اور بستیاں برباد ہوتی ہیں۔ جہاں بوڑھے زیادہ اور جواں کم ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں مائیں بچے جنتے خوشی کے بجائے خوف محسوس کرتی ہیں۔ جہاں بوڑھے کندھوں پر جوان لاشے ہوتے ہیں۔ جہاں کپکپاتے ہاتھ توانا جسموں کو لحد میں اُتارتے ہیں۔ جہاں زندگی کے پُرسوز نغموں کے بجائے موت کے غموں سے لبریز بین سنائی دیتے ہیں۔

متحارب ملکوں کے تعلیمی ادارے متوازن، معتدل اور روادار ذہنوں کے بجائے جنونیوں، شدت پسندوں اور جنگ جُو مزاجوں کی تخلیق گاہیں بن جاتی ہیں۔ جہاں کے فارغ التحصیل شاعر جنگوں کے رزمیے لکھتے اور سائنس دان ایٹم بم بناتے ہیں۔ ان معاشروں کے بچے کتابوں، حروفِ تہجی کے بلاکوں کے بجائے کھلونا پستولوں سے کھیلتے ہیں۔

دونوں سرحدوں کے پار محاذ سے واپس آتے فوجیوں کا استقبال اہل خاندان پھولوں کے ہاروں سے نہیں، بلکہ کفنوں اور ارتھیوں کے ساز و سامان سے کرتے ہیں۔ جنگوں کی آگ میں کُودنے والے ملکوں کے بجٹ تعلیم، صحت اور خوش حالی کے بجائے جنگ، بارود، گولوں اور توپوں کے ذخیروں کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں۔

جنگ زدہ معاشروں میں امن، ادب، تعلیم اور علم و شعور سے وابستہ صنعتیں دم توڑ دیتی ہیں اور ان سے وابستہ طبقے غریب، پس ماندہ اور معاشی بدحالی کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتے ہیں، جب کہ جنگ کے سبب وحشت، موت، قبروں، کفنوں اور ہتھیاروں سے وابستہ صنعتیں پھلتی پھولتی اور ان سے وابستہ طبقے خوش حال اور امیر ہو کر سوسائٹی کے آئیڈیل بن جاتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ آج ہمارے حکمرانوں کو سوچنا چاہیے کہ اگر وہ اپنی نئی نسل کو سو فی صد تعلیم یافتہ، خوش حال اور ترقی یافتہ پاکستان نہیں دے سکے تو جنگ میں سُلگتا پاکستان تو ان کی ہتھیلی پر نہ رکھیں۔ اور عوام کو بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ دنیا میں جنگوں کے تاجروں کے ہاتھوں کھلونا بننے کی بجائے اُن سے اپنے مسائل اور حقوق لینے کے لیے جدوجہد اور تبدیلی کا حقیقی راستہ اپنا کر معاشرے کو آزادی، خوش حالی اور امن سے آراستہ کریں۔ (مدیر)

www.rahimia.org

افکارِ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ

شریعتِ الٰہی کا مقصد؛ انسانی ظلم اور جہالت کا خاتمہ

مترجم: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

{حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ برِعظیم پاک و ہند کی عظیم ترین شخصیت ہیں۔ انھوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں انقلابی افکار اور تعلیمات انسانیت کے سامنے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں بلند پایہ افکارِ عالیہ قلم بند کیے۔ یوں دوسرے ہجری ہزارے میں دینِ حق کی سچی تعلیمات پر مبنی اللہ کی حجت و برہان کو بڑے واضح دلائل کے ساتھ بیان فرمایا۔ اُن کے بیان فرمودہ افکارِ عالیہ آج بھی اپنے اندر تازگی رکھتے ہیں۔ یہ افکارِ عالیہ نئی سیاسی، سماجی اور معاشی تشکیل کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ نیز شریعت و طریقت کی رہنمائی پر مبنی جامع تعلیمات ہیں۔ مترجم}

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حُجّة الله البالغه'' میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت (شریعت کی پابندی) پیش کی تو کسی نے قبول نہ کیا۔ وہ اس سے ڈر گئے۔ انسان نے اس ذمہ داری کو اٹھایا۔ اس لیے کہ وہ بڑا ظالم، بڑا جاہل تھا۔'' (القرآن: 83-82:33)

میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں انسان کو ''ظَلُوم'' بڑا ظالم اور ''جَهُول'' بڑا جاہل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم وہ ہوتا ہے، جس میں عدل کی صلاحیت اور استعداد ہو اور عملی طور پر عادل نہ ہو۔ اور جاہل اسے کہتے ہیں، جس میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہو، لیکن علم و شعور نہ رکھتا ہو۔ انسان کے علاوہ مخلوقات میں فرشتے ایسی مخلوق ہیں کہ جو علم و شعور رکھتے اور عدل و انصاف کرتے ہیں۔ ان میں ظلم اور جہالت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک دوسری مخلوق ہے جو سرے سے نہ علم و شعور حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ ہی ان میں عدل و انصاف کرنے کی استعداد ہے۔ جیسا کہ جانور وغیرہ۔ اس لیے علم و عدل پر مشتمل شریعت کی پابندی اسی مخلوق پر ہوگی، جو انھیں حاصل کرنے کی استعداد اور قوت رکھتی ہو اور شریعت پر عمل سے پہلے یہ کمال اُسے حاصل نہ ہو۔...

(اسے سمجھنے کے لیے درجِ ذیل اُمور کا جاننا ضروری ہے:) پھر سمجھئے کہ

(1) اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین حکمت سے نوعِ انسان میں دو قوتیں رکھی ہیں:

(الف) قوّتِ ملکیہ: انسان میں یہ قوت اس وقت ظاہر ہوتی ہے، جب اُس کی مخصوص روح (مَلَکی) بدن میں سرایت روحِ طبیعی (نسمہ یا روحِ ہوائی) پر اپنا فیضان کرتی ہے اور وہ اسے قبول کر کے اُس کے تابع ہو جاتی ہے۔ (اس قوت کی ضرورت ہے کہ وہ جہالت سے نکل کر علم و شعور حاصل کرے۔)

(ب) قوّتِ بھیمیہ: یہ قوت (انسان میں) اُس نفسِ حیوانی سے پھوٹتی ہے، جو تمام حیوانات میں مشترک ہے اور روحِ طبیعی کے ساتھ قائم قوتوں سے وابستہ ہے۔ یہ قوت ہر انسانی نسمہ کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اسے انسان کی روحِ حقیقی کی موجودگی کا پورا یقین ہوتا ہے اور یہ اُس کے حکم کو قبول کرتی ہے۔ (اس قوت کی ضرورت ہے کہ وہ ظلم سے نکل کر عدل کی صلاحیت حاصل کرے۔)

(2) جاننا چاہیے کہ نوعِ انسان کی ان دونوں قوتوں کے درمیان آپس میں ٹکراؤ اور باہمی کشمکش جاری رہتی ہے۔ قوتِ ملکیہ انسان کو بلندی کی طرف کھینچتی ہے اور قوتِ بہیمیہ انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ جب انسان پر قوتِ بہیمیہ ظاہر ہوتی ہے اور اس کے اثرات غالب آجاتے ہیں تو قوتِ ملکیہ چُھپ جاتی ہے۔ جب انسان پر قوتِ ملکیہ ظاہر ہوتی ہے اور اُس کے اثرات غالب آجاتے ہیں تو قوتِ بہیمیہ دب جاتی ہے۔

(3) یہ بھی جاننا چاہیے کہ (کائنات کے) ہر ایک نظام میں موجود قوتوں پر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس نظام میں موجود ہر چیز جب اپنی اصل استعداد اور اپنی محنت سے حاصل ہونے والی مہارت کے سبب اللہ تعالیٰ سے کسی کام کے ہونے کا مطالبہ کرتی ہے تو اللہ کی جانب سے اس کا مطالبہ پورا کر دیا جاتا ہے۔ اگر انسان اپنی قوتِ بہیمیہ کے مناسب اعمال اختیار کرتا ہے تو اس کے مطابق اس کی مدد کی جاتی ہے اور ایسا عمل کرنا اُس کے لیے آسان بنا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ قوتِ ملکیہ کے مناسب اعمال اختیار کرتا ہے تو اس کے مطابق اسے مدد دی جاتی ہے اور ایسا عمل کرنا اُس کے لیے آسان بنا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

''جس نے مال خرچ کیا اور اللہ سے ڈرا اور نیکی کی تصدیق کی تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف پہنچا دیں گے۔ اور جس نے بخل سے کام لیا، بے پرواہ رہا اور نیکی کی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی میں پہنچا دیں گے۔'' (القرآن: 10-9:92)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تیرے ربّ کی عطا ہم ہر ایک کو پہنچاتے ہیں۔ اُن کو بھی اور اِن کو بھی۔ اور تیرے ربّ کی عطا میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔'' (القرآن: 17:20)

(4) پھر یہ بھی سمجھئے کہ ان دونوں قوتوں میں سے ہر ایک قوت کی ایک لذت اور ایک تکلیف کی حالت ہوتی ہے۔ ہر قوت کو اس کے مناسبِ حال کاموں سے لذت حاصل ہوتی ہے اور اس کی مخالف الحال سے اذیت پہنچتی ہے۔

(دنیا میں) انسان کی حالت کیا خوب اُس آدمی کے مشابہ ہے کہ جس نے نشہ پیا ہوا ہو، جس کی وجہ سے اس کے بدن کو آگ کی گرمی کا احساس نہ ہو۔ یہاں تک کہ جب نشے کا اثر کمزور پڑتا ہے اور طبیعت اپنی اصل حالت میں بحال ہوتی ہے تو اسے جسم کے جلنے کی تکلیف بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یا انسان کی حالت اُس گلاب کے پھول کی سی ہے کہ جس کے بارے میں طبیبوں نے کہا ہے کہ گلاب میں تین قوتیں ہوتی ہیں:

(i) ارضی قوت کہ جو گلاب کے پھول کو گھس کر طلا کی صورت میں جسم پر لیپ کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ (ii) عرقِ گلاب کی قوت، یہ پھول کا عرق نکالنے اور پینے سے ظاہر ہوتی ہے۔ (iii) پھول میں موجود خوشبو کی قوت جو سونگھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔

ان امور سے یہ واضح ہو گیا کہ انسان کو جو شریعتِ الٰہی کا پابند بنایا گیا ہے، وہ اس کا نوعی تقاضا ہے۔ انسان نے اپنی نوعی استعداد کی زبان سے اپنے ربّ سے یہ سوال کیا کہ اس کی قوتِ مَلَکیہ کے مناسب حال اعمال کا علم لازمی طور پر دیا جائے اور اس کا بدلہ دیا جائے۔ اور قوتِ بہیمیہ میں زیادہ انہماک کو حرام قرار دیا جائے، (تاکہ اس میں اعتدال کی حالت پیدا ہو۔) بہ صورتِ دیگر اسے سزا دی جائے۔ واللہ أعلم۔

www.rahimia.org

تربیت کے فطری اصول

ڈاکٹر عبدالرحمٰن راؤ، لاہور

(خانقاہِ رائے پور کے اوّلین صدر نشین حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے تعلیم و تربیت کے لیے مکاتیبِ قرآنیہ قائم فرمائے۔ جس کے لیے طلبا اور متعلّمین ہر دو کے لیے نصاب اور تربیتی پروگرام تشکیل دیا گیا۔ کم و بیش ایک صدی قبل اسی مقصد کے لیے حضرت رائے پوریؒ نے حضرت مولانا نور محمد لدھیانویؒ سے ''تعلیم المعلّمین'' کتاب تالیف کروائی، جو ان حضرات کے تربیتی اسلوب کو واضح کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل افادات اسی کتاب سے زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔)

حضرت مولانا نور محمد لدھیانویؒ لکھتے ہیں: ''بچہ پیدائش کے بعد آنکھ کھولتے ہی ہر ایک چیز کو غور اور تعجب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر قسم کی آوازوں کو سنتا ہے۔۔ اس کی نظر میں ہر ایک معمولی چیز ایک عجیب و غریب عجائب خانہ سے کم نہیں۔ ہر ایک چیز کو دیکھ کر اور ہر قسم کی آواز سن کر اس کو تعجب اور حیرت، ہر چیز کو معلوم کرنے کی اس کو خواہش اور رغبت ہوتی ہے۔ بار بار ہر ایک چیز کو دیکھنے اور سننے سے ہر ایک چیز کا مقابلہ کرنا اور سوچنا سمجھنا اور یاد رکھنا شروع کرتا ہے۔ اس کی والدہ اس کی استانی ہوتی ہے جو بچے کو قدرتی اور فطری طور پر تعلیم دیتی ہے۔ غور کا مقام ہے کہ والدہ نے ایسے بے سمجھ اور کم استعداد بچے کو تین چار سال میں روزمرہ کی ضروریات سے واقف بنا دیا۔۔ اگر معلم قدرتی اور فطری طور پر تعلیم دیں تو بہت جلد ترقی اور استعداد پیدا ہو۔ قدرتی اور فطری تعلیم اس طرح پر ہے کہ ایک ایک چیز کو کئی کئی دنوں اور ہفتوں اور مہینوں سکھایا جائے اور روزانہ اس کی مشق ہو۔ بچوں کو جو تعلیم دی جائے اس کی مشق جاری رہے۔''

ہر بچہ اپنے گردوپیش کے بارے میں متجسس ہوتا ہے۔ اس کا شوق اور جستجو ہی اس کو تحصیلِ علم کی جانب آگے بڑھاتا ہے۔ وہ سوال پیدا کرتا ہے اور سیکھنے کے لیے مشاہدہ، تقابل، سمجھنے اور یاد کرنے کے مراحل کو اپناتا ہے۔ چناں چہ یہی فطری انداز تربیت ہے کہ شوق کو مہمیز دی جائے، جستجو کو بڑھایا جائے، سوالات کی تسکین کے لئے تقابل باہمی کے ذریعے سے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے۔ نیز عملی مثالوں اور عملی مشقوں کی مدد سے فہم کو بڑھایا جائے تاکہ نتائج کو گردوپیش کے حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

ماں اپنے بچے کو انھی فطری مراحل سے گزارتی ہے۔ اس کا اخلاص اور محبت مثالی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی گذارنے کے بہت سے بنیادی امور بچہ چند سالوں میں سیکھ لیتا ہے اور یہی طریقۂ تربیت اہل اللہ اور علمائے ربانیّین کا ہوتا ہے وہ والدہ کی مانند شفیق اور والد کی طرح نگران اور مربی ہوتے ہیں۔ یہی اندازِ تربیت ان مرشدین کو مرجع خلائق بناتا ہے۔ دورِ حاضر کے ماہرین تعلیم بھی انھی بنیادی امور کی نشان دہی کرتے ہوئے ایک ایسی مثالی تربیت گاہ کی ضرورت پر زور دیتے ہیں جو ان فطری اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نسلِ نو کی تعلیم و تربیت میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

ٹیکس اور نظام کا زوال

محمد کاشف شریف، راولپنڈی

عوام کی سیاسی عمل میں شمولیت کا معیار اُن کے مالی معاونت کے رویے سے طے پاتا ہے۔ مشہور امریکی صدر ابراہم لنکن نے نعرہ لگایا کہ No taxation without representation، یعنی حق نمائندگی کے بغیر ٹیکس نہیں لیا جا سکتا۔ اسی تناظر میں دنیا بھر میں ٹیکس قوانین بنائے جاتے ہیں، جن میں ٹیکس اکٹھا کرنے سے لے کر اُسے خرچ کرنے کے اُمور وضع کیے جاتے ہیں۔ ٹیکس کی دو اقسام رواج میں ہیں: ایک براہِ راست Direct Tax اور دوسرا بالواسطہ Indirect Tax۔ براہِ راست طریقے میں مالی معاونت کرنے والے شہری کو علم ہوتا ہے کہ اُس کی آمدن میں ضرورت سے زائد رقم پر کتنا ٹیکس لیا جا رہا ہے اور اس کے بدلے میں حکومت پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ یہ ایسا ٹیکس ہوتا ہے جو مال داروں سے زیادہ وصول کیا جاتا ہے اور دیگر طبقوں سے کم۔ اس قسم کا ٹیکس کئی طبقوں پر تو لاگو ہی نہیں ہوتا، جیسے کم مال والے، آفت زدہ اور خدمت، تحقیق و تعلیم سے وابستہ افراد۔ یوں زیادہ دولت والوں سے مال کم دولت والوں کی طرف رواں رہتا ہے اور محروم طبقے وجود میں نہیں آتے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ طبقے جن پر براہِ راست ٹیکس کا اطلاق نہیں ہوتا اُنھیں بالکل ہی مالی معاونت کے عمل سے دور رکھا جائے۔ اس لیے بالواسطہ ٹیکس کا نظام وضع کیا جاتا ہے، تاکہ معاشرے کا ہر فرد اپنی طاقت کے مطابق کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ڈالے۔ ٹیکس کا وہ نظام جہاں زیادہ وصولی براہِ راست طریقے سے کی جائے، عوام کی ترقی اور خوش حالی کے لیے بہتر ثابت ہوا ہے۔ اس نظام سے درجاتِ معیشت میں تفاوت پر مؤثر کنٹرول قائم کیا جا سکتا ہے۔

ہر دوسرے شعبے کی طرح پاکستان کا یہ شعبہ بھی فکری بحران اور عملی فقدان کا شکار ہے۔ براہِ راست ٹیکس کے نظام میں قابل اور فعال ٹیکس اہل کار اور مستعد عدالتی نظام ناگزیر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹیکس ادا کرنے والوں میں قومی و اجتماعی شعور اس عمل کو کامیاب کرتا ہے۔ اب یہ تمام لوازمات تو پاکستان اور اس کی عوام کے لیے اجنبی ہیں۔ اس لیے ہوتا یوں ہے کہ ٹیکس کے سالانہ اہداف میں 75% بالواسطہ اور 25% براہِ راست ٹیکس کی مد میں طے کیے جاتے ہیں، جن میں عموماً بالواسطہ ٹیکس ہی ہدف پورا کر پاتا ہے۔ چناں چہ ٹیکس فائلرز میں اضافے کے تناظر میں تمام حکومتی کوششیں ناکام ہوتی نظر آتی ہیں۔ 2011ء تک کُل ٹیکس فائلرز کی تعداد چودہ لاکھ تھی، جو موجودہ حکومت کے آنے کے بعد بہ تدریج کم ہو کے آٹھ لاکھ تک آ گئی۔ جسے گزشتہ دو سالوں کی بھرپور کاوشوں کے بعد پھر سے گیارہ لاکھ پر لایا گیا ہے، جو ٹیکس نیٹ میں بڑھوتری کے حوالے سے ایک مایوس کُن خبر ہے۔ دراصل یہی وہ اعتماد کے فقدان کا اظہار ہے، جو حکومت کو بالواسطہ ٹیکس پر مجبور کرتا ہے۔ یہ ٹیکس جگا ٹیکس کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، یعنی کوئی فائلر ہو یا نہ ہو، مال دار ہو یا نہ ہو، اُسے ضروریاتِ زندگی پر ٹیکس دینا ہوگا۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے ٹیکس کا نظام بالآخر نظام کے زوال کا سبب بنتا ہے۔

www.rahimia.org

عالمی منظر نامہ

مرزا محمد رمضان، راولپنڈی

شنگھائی تعاون تنظیم اور پاکستان

مولانا محمود حسنؒ جنھیں تحریک جدوجہدِ آزادیٔ ہند کی ایک کڑی خلافت کی مرکزی کمیٹی نے ہندوستان کی کامل آزادی کی جدوجہد میں مرکزی کردار ادا کرنے کے طور پر ''شیخ الہند'' لقب دیا تھا، کے ایک بااعتماد شاگرد و ساتھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے جب اقوامِ عالم میں ہونے والی توڑ پھوڑ کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ و مشاہدہ کیا تو جہاں انھوں نے قومی مسائل اور ان کے حل کا ایک فارمولا پیش کیا، وہیں اقوام کو اپنے علاقائی پیش آمدہ تنازعات کو نمٹانے کا عملی سیاسی و اقتصادی ماڈل 15/ستمبر 1924ء کو ایشیاٹک فیڈریشن کے نام سے بھی متعارف کروایا۔ ہند کی اقوام آج تک اس ماڈل پر عمل درآمد نہ کرنے کی وجہ سے اندرونی اور بیرونی مشکلات میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ان مشکلات کی جڑیں جہاں قومی سطحوں پر پھیلی ہوئی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قوتوں کا کردار بہت اہم اور کلیدی ہے، جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے اپنے ایک درس میں داناؤں کی رہنمائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

> ''یورپی اقوام جب کوئی غلطی کرتی ہیں تو اس سے سبق سیکھنے کے لیے اس واقعے کی مکمل تحقیق کرتی ہیں۔ اور اس دوران ان تمام محرکات کا جائزہ لیا جاتا ہے، تاکہ آئندہ اس قسم کے اقدامات سے گریز کیا جاسکے۔''

مشرقی یورپ یعنی روس اور ہمالیہ کے شمال میں بسنے والی چینی اقوام نے اپنے گزشتہ تنازعات کا جائزہ لیتے ہوئے ان سے سبق سیکھ کر ان مسائل کو حل کرنے کے لیے علاقائی اتحاد کا ایک ماڈل 26/اپریل 1996ء میں ''شنگھائی فائیو'' کے نام سے چین کے آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑے شہر شنگھائی میں تشکیل دیا۔ ابتدائی طور پر جن ممالک نے اس کے بنیادی چارٹر پر دستخط کیے تھے، ان میں قازقستان، چین، کرغستان، روس اور تاجکستان شامل تھے۔ اس کے بعد 15/جون 2001ء کو ایشیائے کوچک کی ایک اور قوم ازبکستان بھی اس معاہدے میں شامل ہوگئی۔ جس نے اس معاہدے کو ایک نیا نام دے کر ''شنگھائی تعاون تنظیم'' بنادیا۔ پاکستان 2005ء میں بہ طور مبصر مذکورہ تنظیم میں شامل ہوا۔ 2010ء میں درخواست دینے والا یہ پہلا ملک تھا، جس نے کہا کہ اسے بھی تنظیم کا باقاعدہ رکن بنایا جائے۔ کیوں کہ یہ تنظیم درجِ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے وجود میں آئی تھی: 1۔ امن کا قیام، 2۔ علاقائی استحکام، 3۔ رکن ملکوں کے مابین دیرپا دوستی کا فروغ، 4۔ عدل و انصاف پر مبنی سیاسی، معاشی ڈھانچے کا قیام، 5۔ دہشت گردی، انتہاپسندی، علاحدگی پسندی اور منشیات جیسی لعنتوں کو جڑ سے اکھاڑنا۔ مذکورہ تمام مقاصد کے پس پردہ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کوئی ملک ارکان کے علاوہ بھی کسی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کا ارتکاب نہیں کرے گا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ متحدہ کا ادارہ اپنے قیام سے سلامتی کونسل کے ارکان کے درمیان سردجنگ کی لپیٹ میں چلا گیا۔ اگر ایک طرف مشرقی یورپ کے ملکوں کے درمیان ''وارسا پیکٹ'' نام کا فوجی اتحاد قائم ہوتا ہے تو دوسری طرف مغربی یورپ کے ملکوں کے مابین ''نیٹو'' وجود میں آجاتا ہے۔ ان دونوں بلاکوں نے دنیا کا ماحول جنگ سے آلودہ کردیا۔ بلاکوں کی اس سیاست نے اپنے اپنے علاقوں میں اسی مناسبت سے زیریں ملکوں کو اپنی اپنی حکمتِ عملی کا حصہ بنالیا۔ دنیا میں اس سے پہلے بھی کئی علاقائی اتحاد وجود میں آئے۔ جیسے سارک، آسیان، عربوں میں عرب لیگ، افریقا میں افریقن نیشنل کونسل اور غیروابستہ ممالک کی تحریک وغیرہ، لیکن یہ اتحاد اپنے قیام سے آج تک کوئی گراں قدر مثبت کردار سے گریزاں رہے۔ نیز ایسے تمام اتحادوں کا بنیادی مقصد خطے میں سامراجی مقاصد کے لیے معاونت کا کردار ادا کرنا مقصود رہا ہے۔ جس زمانے میں سارک قائم ہوئی، اس وقت ہندوستان میں کانگرس کی حکومتوں کا دور تھا۔ اور کانگرس اپنے قیام سے قومی نمائندگی اور جدوجہدِ آزادی کے کردار سے متعارف تھی۔ اس کا قوم میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی یعنی رواداری کے خمیر سے اٹھان ہوا تھا۔ چناں چہ آزادی کے بعد قومی استحکام کے نتیجے میں اس کا اگلا ہدف غیرمنقسم ہندوستان کے ملکوں کے مابین علاقائی سلامتی کو فروغ دینا تھا، لیکن ہمسایہ ملکوں میں جنگوں کو پیدا کرکے خطے کی سیاسی فضا کو مکدر کیا گیا۔

جنگ و جدل کے اس ماحول میں ملکوں کے بجٹ کا کثیر حصہ سرحدوں کی حفاظت کے نام پر اسلحے کی خریداری پر خرچ ہونے لگا۔ وہ رقم جو ملک میں سامراج کے دور میں پیدا کردہ غربت و افلاس کو مٹانے کے لیے صَرف ہونی چاہیے تھی، وہ اسی کے طے کردہ اہداف کے حصول پر ضائع ہونے لگی۔ مسئلہ کشمیر کو پیدا کرکے علاقے میں مذہبی منافرت اور فرقہ پرست تنظیموں کے پھوٹنے سے دہشت گردی کو پروان چڑھایا گیا۔ مستقل بدامنی کے نتیجے میں علاقے میں عدمِ استحکام کو فروغ ملا۔ محض اتحاد بنالینے سے مسئلے حل نہیں ہوتے، بلکہ اتحاد بنانے والی قوتوں کے پس پردہ مقاصد کیا تھے؟ ان کا زندگی کے بارے میں نظریۂ حیات کیا ہے؟ یہ سب چیزیں مل کر اتحاد کے قیام اور استحکام کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔

23/جون 2016ء کو جب پاکستانی صدر تاشقند میں ایس سی او کے سربراہ اجلاس میں شرکت کے لیے جارہے تھے تو پہلے سے موجود ارکان نے ان کی تنظیم میں مکمل رکنیت کی منظوری دینی تھی۔ اس اتحاد کا حصہ بننے سے پاکستان کا تعلق ایشیائی طاقتوں کے ساتھ مضبوط ہونا شروع ہوجائے گا۔ چوں کہ پاکستان اور بھارت دونوں نے ہی مکمل رکن بننے کے لیے درخواست دے رکھی ہے، اس لیے روس اور چین نے کہا ہے کہ دونوں کے رکن بننے سے S.C.O مزید مضبوط اور مستحکم ہوجائے گی۔ یہ تنظیم نہ صرف رکن ملکوں کے وسائل کو ترقی دینے کا ذریعہ بنے گی، بلکہ انھیں سیاسی تحفظ بھی فراہم کرے گی۔ جس سے خطے میں امن قائم ہوگا۔ ایشیا میں قائم ہونے والا یہ استحکام عالمی جنگوں کے خاتمے کے لیے سنگِ میل ثابت ہوگا۔ عالمی رجحانات کے ماہرین کے بہ قول آئندہ دنیا کی طاقت کا مرکز ایشیا کی طرف منتقل ہوتا جارہا ہے۔ جن قوموں کی سیاست مضبوط ہوتی ہے، انھیں کا معاشی ڈھانچہ رنگ لاتا ہے۔

www.rahimia.org

خطبات و بیانات

افادات: حضرت مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ
جانشین حضرت رائے پوری رابعؒ و مسند نشین خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے 14 راکتوبر 2016ء بروز جمعۃ المبارک کو ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ لاہور میں نمازِ جمعہ کے شرکا سے خطاب فرمایا، جس کے چند اہم اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

جمعہ؛ اجتماعیت کا ایک اہم نمونہ

''معزز دوستو! جمعۃ المبارک ایک ایسا بابرکت دن ہے کہ جس میں مسلمانوں کی اجتماعیت دُنیوی اور اُخروی کامیابی کے لیے ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔ دین اسلام ایک ایسا دین ہے، جو انسانوں کی اجتماعیت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ افراد کی ترقی کے لیے بھی معاشرے کے اجتماعی تقاضوں کی تکمیل ضروری قرار پاتی ہے۔ اس لیے دین اسلام نے اپنی تمام عبادات میں اجتماعیت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اسی اجتماعیت کو قائم کرنے کے لیے جمعۃ المبارک ہے۔ جمعۃ المبارک کو اس لیے جمعہ کہا جاتا ہے کہ یہ اجتماعیت کا دن ہے۔ اجتماع کی برکات لینے کا دن ہے۔ اجتماعیت کی فلاح و بہبود کے لیے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کا دن ہے۔

یوں تو دین کی تمام عبادات اجتماعیت کا رُخ لیے ہوئے ہیں۔ نماز جس کی ذمہ داری سب سے زیادہ مسلمانوں پر عائد کی گئی ہے، پانچ وقت کی نماز کو ایک اجتماع کے اندر جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا کہ وہ پانچوں وقت اپنے محلے کی مسجد میں، اپنی قریب ترین مسجد میں ایک اجتماع قائم کریں۔ عبادت اجتماعی طور پر کریں۔ یہ اجتماعیت انسانی فائدے کے لیے ہے۔

عبادت کا اصول تو یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ یہ بندے اور اللہ کے درمیان راز و نیاز ہے اور راز و نیاز کے لیے تو تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرد کے لیے تنہائی کی انفرادی حالت، جہاں وہ کسی محبوب سے گفتگو کرتا ہے، اس موقع پر اُسے دوسرے لوگوں کی مداخلت ناگوار گزرتی ہے۔ اس لیے اللہ سے تعلق اور اللہ کے ساتھ انسانیت کی محبت کا لازمی تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ یہ عبادت تنہائی میں ادا کی جائے۔ لیکن چوں کہ انسانیت کا اللہ سے تعلق صرف انفرادی طور پر مطلوب نہیں ہے، بلکہ اللہ نے اس تعلق کے لیے لازمی قرار دے دیا کہ نماز کو جماعت کی صورت میں ادا کیا جائے۔ یعنی اللہ سے محبت کا اظہار بھی اجتماعی طور پر ہو، تاکہ پورے اجتماع اور سوسائٹی کو جماعت سے نماز پڑھنے کا فائدہ پہنچے۔ اس لیے اکیلا نماز پڑھنے کی بجائے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا پچیس درجے یا ستائیس گنا زیادہ ثواب ہے۔ یہ اس لیے کہ آدمی اپنی انفرادیت ترک کر کے ایک مجمع کے اندر جاتا ہے۔ اور یوں اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ اجتماعیت کو قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

امامتِ صغریٰ اور امامتِ کبریٰ

حضرت اقدس رائے پوری مدظلہٗ نے خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا:

''دین اسلام میں ہر عبادت اجتماعیت لیے ہوئے اور ہر اجتماعیت کا ایک اداراتی نظام ہوتا ہے۔ جمعہ کی اس اجتماعیت کے لیے ایک نظام کی ضرورت ہے۔ اور وہ نظام، نظامِ حکومت ہے۔ اس لیے جمعہ کا خطبہ دینے کا حکم شہر کے حاکم کے لیے ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جو شخص خطبہ دیتا ہے، لوگوں کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، اس کے پاس کوئی اتھارٹی ہونی چاہیے، تاکہ اُسے لوگوں کے مسائل کا پتہ چلے۔ لوگوں کے ساتھ مکالمہ کرے اور ان کی خبر گیری کرے۔ جب وہ جمعہ کے اس بڑے پورے اجتماع سے مخاطب ہو تو مجمع کو دیکھے اور اُس کے حالات سے واقفیت حاصل کرے۔ اُن کے اٹھنے بیٹھنے، آنے جانے کے رویے معلوم ہوں۔ اس پر ان کی رہنمائی کی جائے۔

اس لیے شریعت میں جیسے نماز کا ایک امام ہے، ایسے ہی امامتِ کبریٰ ہے، جس کو حکمران اور امام المسلمین یا مسلمانوں کے اجتماع کا امام کہتے ہیں۔ وہ ہر وقت کا امام ہوتا ہے۔ امام اُسی کو کہا جاتا ہے، جو قاعدے، ضابطے، طریقۂ کار، نظم و نسق چلانے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ امامت کا مطلب صرف نماز پڑھانا نہیں، بلکہ وہ تو اُس کا ایک جز ہے کہ نماز کی امامت بھی کرائے۔ امام کا اصل مطلب تو رہنما ہے۔ وہ منتخب نمائندہ، جس کے ہاتھ پر ہم نے بیعت کی، ووٹ دیا، رائے دی، اپنی اجتماعیت کا اُسے نمائندہ بنایا۔

اس طرح جمعہ کی نماز یا پانچ وقت کی نمازوں کی امامت ''امامتِ صغریٰ'' ہے۔ جب کہ معاشرے کی پوری اجتماعیت کو کنٹرول کرنا ''امامتِ کبریٰ'' ہے۔ اور یہ دو طرفہ عمل ہوتا ہے۔ جیسے یہ اجتماع ڈسپلن اور نظم و ضبط قائم کرنے میں اپنے حکمران کا تابع ہے، ایسے ہی حکمران بھی عوام کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اگر عمل دو طرفہ ہو تو اجتماعیت درست طور پر ترقی کرتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اجتماعیت کے قیام کے لیے اس اجتماع اور اس کے حکمران طبقات کے درمیان کوئی مغایرت یا افتراق و انتشار کی شکل نہیں ہونی چاہیے۔ سب ایک معاشرے کے فرد ہیں۔ اس امامِ کبیر (حاکم) کے پاس اگر کوئی اختیار ہے تو وہ بھی سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ہے، نہ کہ ذاتی اغراض و مقاصد اور خاندانی و گروہی مفادات کے لیے۔ پھر یہ اجتماعیت اور نظم و نسق تبھی درست طور پر قائم ہوتا ہے کہ جب نیچے سے لے کر اُپر تک تمام کام باہمی مشاورت اور ادارہ جاتی طریقۂ کار کے مطابق سرانجام دیں۔ اگر اداروں کی اہمیت نہ ہو، مشاورت نہ ہو تو اجتماعیت نہیں، آمریت اور انفرادیت ہوتی ہے۔ جیسے ایک فرد کی انفرادی سوچ غلط ہے، ایسے ہی ایک حکمران کی انفرادی سوچ اس سے زیادہ غلط ہے۔ کیوں کہ وہ تمام لوگوں کا ذمہ دار ہے۔ اگر ایک امام (حاکم) غلطی کرے، وہ انفرادیت سے کام لینے لگے تو اُس کا آمرانہ رویہ اپنا لینا، اُس کا انفرادی خواہشات کے مطابق حکومتی نظم و نسق چلانا، یہ پورے معاشرے کے لیے تباہی و بربادی کا باعث ہوتا ہے۔''

www.rahimia.org

قیادت کی صلاحیت اور معیار

حضرت اقدس رائے پوری مدظلہٗ نے خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا:

''قدیم زمانے کے معاشروں میں حکمران خاندان، بہادر اور دلیر ہوتے تھے۔ ان کے اندر جرأت و ہمت بھی ہوتی تھی اور علم و عقل بھی۔ اسی لیے لوگ انھیں اپنے اجتماع کے مفاد کا نگران بناتے تھے۔ اور وہ اجتماع خواہ کسی خاندان یا کنبے کا ہوتا، کسی شہر اور محلے کا یا کسی مملکت کا، اس کے وہ بادشاہ بنائے جاتے۔ بادشاہت مفت میں نہیں ملتی تھی۔ بادشاہوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں! جب بھی کسی خاندان کی بادشاہت دنیا میں قائم ہوئی، اُس میں دو بنیادی صلاحیتیں تھیں: **بسطة فی العلم و الجسم**۔ اُس کی علمی اور عقلی اور اجتماعی نظم و نسق چلانے کی صلاحیت دوسروں سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی طرح اُس کی جسمانی طاقت، لڑائی بھڑائی اور اپنے اجتماع اور سوسائٹی کی حفاظت کی طاقت، اُس اجتماع کے ہر فرد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس لیے وہ حکمران بھی ہر شعبے کے بہتر فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔

پھر جیسے جیسے وقت گزرا اور وہ جسمانی اور علمی صلاحیتیں ختم ہونا شروع ہوئیں، اکیلا آدمی یہ سارے کام نہیں کرسکتا تھا۔ نئے وسائل اور نئے ذرائع دریافت ہوئے تو بادشاہت کی جگہ پر جمہوریت کا نظام انسانوں کے سامنے آیا کہ ایسے عقل مند، سمجھ دار لوگوں کا ادارتی نظام، اُن کا تھنک ٹینک بنایا جائے، جو سوسائٹی کے پیچیدہ اجتماعی مسائل پر غور و فکر کر کے ادارہ جاتی عمل کے ذریعے سے نیچے سے لے کر اوپر تک اجتماعی اُمور کو سرانجام دینے کے لیے باقاعدہ آئین و دستور بنائیں۔ عمل درآمد کا طریقۂ کار طے کریں۔ پھر اس کی اساس پر نظم و نسق قائم کرنے کا اجتماعی نظام بنائیں۔

جمہوریت کا یہی مطلب ہے کہ کوئی بھی اجتماعی کام کیا جائے تو وہ عوام کے مفاد میں ہو۔ اس حوالے سے جمہور کی رائے کا سامنے آنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ادارے بنائے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ سے منظوری لی جاتی ہے۔ کابینہ بنائی جاتی ہے۔ پھر اُس کام کے ماہرین کی ٹیم بنائی جاتی ہے۔ وہ Feasibility Report پیش کرتی ہے کہ یہ چیز اس طریقے سے بنے گی اور اس کے سوسائٹی پر یہ اثرات پڑیں گے۔ اس کا مستقبل میں یہ سیاسی، معاشی، اجتماعی فائدہ کچھ اس طرح ہوگا۔

آج مسلمان ملکوں کا یہ المیہ ہے کہ وہاں ادارہ جاتی بنیادوں پر کام کرنے کی بجائے one man show ہے۔ ایک ایسے وقت میں کہ جب مہذب دنیا اپنے معاملات اجتماعیت اور جمہوریت کی بنیاد پر چلا رہی ہے، ہمارے ہاں ابھی تک پُرانے دور کے بادشاہوں اور خلفا کے قصے کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور اس کے نام پر اپنی گدیاں چمکانے اور اپنی شہنشاہیت کو برقرار رکھنے کے حربے سوچے جاتے ہیں۔ اسلام کے نام پر ملک بنایا جاتا ہے اور اجتماعیت کے بخیے اُدھیڑنے، جمہور کو آمریت کی آلہ کاری کا کردار ادا کرنے، اُس اجتماع کو سامراجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا کردار ادا کیا جاتا ہے۔''

بادشاہت اور جمہوریت

حضرت اقدس رائے پوری مدظلہٗ نے خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا:

''آج سوچنا ہے کہ جمعہ جو اجتماعیت کے لیے ہے۔ سوسائٹی کے اجتماعی تقاضوں کی ادارہ جاتی تشکیل اور کردار کے لیے ہے، وہ جمعہ آج انفرادیت کا شکار کیوں ہوگیا۔ لوگ جمعہ میں آتے بھی ہیں تو وہ بھی انفرادی نیت سے۔ کسی اجتماعی سوچ کو قبول کرنے کے لیے نہیں آتے۔ اور چوں کہ اس کا اجتماعی نظام نہیں تو ہر محلے میں لوگوں نے اپنا اپنا جمعہ شروع کر کے اُس انفرادیت کو دوبارہ قائم کر دیا، جس کو توڑنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے اس اجتماع کو قائم کرنے کا حکم دیا تھا۔ آج یہ اجتماعی سوچ پیدا ہونا ضروری ہے۔ اجتماعیت نہ ہو، جمہوری ادارتی عمل نہ ہو تو بادشاہت ہوتی ہے۔

اب تو ہمارے ملک کے چیف جسٹس بھی پکار اٹھے ہیں کہ ملک میں ''جمہوریت کے نام پر بادشاہت قائم ہے۔'' اجتماعیت کی تباہی و بربادی کی بات یہاں تک پہنچ چکی کہ ملکی اداروں کے سربراہان بھی سوسائٹی کی اس ٹوٹ پھوٹ کو بیان کرنے پر مجبور ہیں۔ پھر عوام سے مضحکہ خیز مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں۔ گویا کہ ہم نے ادارتی طور پر کچھ نہیں کرنا، ہمارے ملکی اداروں نے کوئی کردار ادا نہیں کرنا، جو کرے، عوام کرے۔ اور اگر عوام آئے تو کیا کرے؟ دھرنے دے کر انھوں نے دیکھ لیے۔ نعرے لگا کر انھوں نے دیکھ لیے۔ اگر یہاں کا الیکشن کمیشن جاگیرداروں میں سے چند خاندانی لمیٹڈ کمپنیوں کو ''سیاسی جماعت'' ہونے کے سرٹیفکیٹ جاری کرے اور ان بادشاہتوں اور آمر خاندانوں میں سے کسی ایک خاندان کو قبول کرنے کا عوام کے سامنے آپشن رکھے تو عوام کیا کریں گے؟ انھیں دو آمروں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

اب یہاں بھی قصور عوام کا ہے کہ عوام ایسے لوگوں کو جمہوریت کے نام پر بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ بھئی! کیا یہاں کے مقتدر طبقوں نے ذرا اپنے الیکشن سسٹم پر غور کیا ہے؟ یہ الیکشن رولز ہی ایسے ہیں کہ جس میں سرمایہ دار اور مخصوص خاندان انتخاب لڑنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ آپ اسے توڑو، عوام کے نمائندے عوام ہی بنیں۔ مزدوروں کا نمائندہ صرف مزدور ہونا چاہیے۔ کوئی سرمایہ دار نہ ہو۔ کسانوں کا نمائندہ صرف کسان ہو۔ کوئی جاگیردار نہ ہو۔ تو دیکھو سوسائٹی میں جمہوریت قائم ہوتی ہے کہ نہیں ہوتی۔ لیکن جب تم نے قانونی طور پر اجازت دے دی کہ جی کسانوں کا نمائندہ لینڈ لارڈ ہوسکتا ہے۔ اس لینڈ لارڈ نے تو طاقت کے بل بوتے پر غریب سے ووٹ لے ہی لینا ہے۔ اب عوام کا قصور ہوا یا تمھارے سسٹم کا قصور ہوا؟ تو سسٹم کی خرابی پر کوئی بات نہیں کی جاتی۔ صرف عوام سے وعظ کہہ دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سسٹم کو بدلنے کی ضرورت ہے کہ جو سسٹم اجتماعیت کے قائم کرنے کے راستے کی رُکاوٹ ہے۔ جب تک اجتماع کے مفاد کا انتخابی نظام، اجتماعی نظام وجود میں نہیں آتا، اس وقت تک اجتماعی مسائل حل کرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ عقل و شعور عطا کرے اور دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب کرے۔''

www.rahimia.org

بچوں کا کالم — چوہدری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ

پُراثر تحریر لکھنے کے اصول

(چوہدری افضل حقؒ آزادی کے عظیم رہنما تھے۔ اپنی قوم کی تعلیم و تربیت اور اَخلاقی معیار کی بلندی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ ذیل میں ان کے اُن خطوط کی تلخیص شائع کی جارہی ہے، جو اُنھوں نے 1939ء میں راولپنڈی جیل سے اپنے بچوں کے نام لکھے۔ دراصل ان کے مخاطب قوم کے ہر دور کے نونہال ہیں۔ مدیر)

بقیہ گزشتہ مکتوب

شاعری کی مضرت سے بچ کر شعر کہے جائیں۔ گزشتہ شاعروں کے عمدہ کلام سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ زبان کی اچھی اچھی ترکیبیں اور عمدہ عمدہ استعارے زیرِ مطالعہ رہیں تو اپنی تحریر بھی شگفتہ ہو جاتی ہے۔ کسی زبان کا اچھی طرح جاننا ہر زمانے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ تم خط لکھتے وقت لفظوں کی عمدہ بندش کا خیال رکھو۔ خطوں میں الفاظ سادہ، تحریر میں کچھ بے ساختہ پن ہونا چاہیے۔ جیسا مضمون ہو، ویسی تحریر پسندیدہ ہوتی ہے۔ خطوں میں الفاظ کی سادگی اور بے ساختہ پن کا اس لیے لحاظ رکھا جاتا ہے، گویا دو ہم کلام اشخاص میں سے ایک اپنی بات بیان کرتا ہے۔ اسلوب یہی ہونا چاہیے کہ جو عام گفتگو میں ہوتا ہے۔ خط لکھنا گویا ایک جانب کی گفتگو کو ضبطِ تحریر میں لانا ہے۔ جس انداز سے گفتگو کی جاتی ہے، اس انداز تحریر کو خط میں قائم رکھا جائے تو خط موتیوں کی لڑی بن جاتا ہے۔

باقی مضامین کی ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے عام قاعدہ یہی سمجھو کہ تمھاری تحریر عام طور پر شگفتہ ہو۔ الفاظ بے جان اور عبارت ڈھیلی نہ ہو۔ اس کے لیے عمدہ عمدہ شعر یاد کرو۔ شستہ محاورے استعمال کرو۔ تھوڑا لکھو، مگر تحریر ایسی پاکیزہ ہو کہ پڑھنے والے کے دل کی کلی کھل جائے۔ اچھے اچھے مصنفوں کی کتابوں کو اس نظر سے پڑھو کہ اس کے عمدہ فقرے اور اچھی بندشیں تمھارے ذہن نشین ہو جائیں۔ پھر خود لکھتے وقت اپنی تحریر میں نئی سے نئی بندش پیدا کرو۔ جتنے شعروں کی عمدہ ترکیبیں دماغ میں محفوظ ہوں گی، اتنی ہی تحریر میں مدد ملے گی۔ صرف کتابوں کا کیڑا بننے سے بھی اچھا شاعر اور ادیب نہیں ہو سکتا۔ شاعر و مصنف دونوں کے لیے فطرت کا وسیع مطالعہ اور اہلِ دنیا کی عام ہمدردی ہونی چاہیے۔ دردمند دل کے بغیر کلام میں درد پیدا نہیں ہو سکتا۔ مخلوقِ خدا پر رحم، خدمتِ خلق کا جذبہ دل میں ہونا چاہیے۔ دل کا رنگ ہی تحریروں میں جھلکتا ہے۔

خدا تم سب کو عمر اور صحت دے اور نیکی کی توفیق عطا کرے۔ نیکی کی زندگی بڑی نعمت ہے۔ بچپن میں دل یوں بھی معصوم ہوتا ہے۔ بڑی عمر میں پتہ لگتا ہے کہ جو دم خدا سے غافل رہا، وہ ضائع ہوا۔ خدا کی یاد اور خدا کے بندوں کی خدمت، یہی سچی زندگی ہے۔ عبادت اور خدمت دو لفظوں میں دنیا اور دین کی بھلائی پوشیدہ ہے۔ جو بچپن سے خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت کا خیال رکھتے ہیں، بڑے ہو کر خدا کی حفاظت میں رہتے ہیں۔ شیطان ان کو ورغلا نہیں سکتا۔

تاریخ اسلام کے ناقابل فراموش واقعات — مولانا مفتی عبدالقدیر، چشتیاں

شجاعت اور بہادری کی نادر حکایت

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اپنی شاہکار کتاب ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق'' میں شجاعت کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ضرورت اور حاجت کے وقت مصائب و خطرات کا ثبات قدمی کے ساتھ مقابلہ ''شجاعت'' کہلاتا ہے۔ اور بعض لوگوں نے جو یہ سمجھ لیا ہے کہ شجاعت ''بے خوفی'' کا نام ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو شخص نتائج پر نگاہ رکھے اور اس کے پیش آنے سے خوف زدہ ہو، مگر جب وہ سامنے آجائیں تو ثبات قدمی سے ان کا مقابلہ کرے، تو وہ ''مرد بہادر'' ہے۔

عبدالملک بن مروان کی ایک حکایت اس سلسلے میں بہت مشہور ہے کہ ایک دن اس کے پاس ابن زیاد کے قتل اور اس کے لشکر کی شکست کی اطلاع پہنچی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا، اور دمشق نے بھی اس کے خلاف بغاوت کر دی، اور روم کا بادشاہ بھی شام کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔

ان تمام وحشت ناک اطلاعات کے باوجود نہ اس کا دل پریشان ہوا اور نہ اس کے حواس پر اثر پڑا۔ اور اس پورے دن میں وہ مطمئن قلب اور خوش چہرہ پایا گیا۔ پھر روم کے بادشاہ کو تو ادائے خراج میں مشغول کر لیا اور فلسطین پر لشکر بھیج کر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور خود دمشق پہنچ کر اپنے مخالفین کو شکست دی۔'' (ص:342)

عبدالملک بن مروان قریش کے ان بارہ سرداروں میں سے ایک ہے جن کے بارے میں پیشین گوئی تورات میں آئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قریش کے بارہ خلفا ہوں گے۔'' محققین کے ہاں ان بارہ خلفا میں عبدالملک اور اس کے تین صاحبزادگان آتے ہیں۔

خلافت اور سرداری کا منصب اعلیٰ اخلاق اور زبردست بہادری کا تقاضا کرتا ہے۔ ان خلفائے اسلام نے اپنی بے مثال بہادری دکھائی اور مصائب و مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ ہمارے نونہالوں کے لیے ان کا اعلیٰ کردار قابل تقلید ہے۔

آج کل بلا سوچے سمجھے خود کو ہلاک کرنا اور دوسروں کو تباہی سے دوچار کر دینے کا نام بہادری سمجھا جاتا ہے۔ چاہے دشمن کا ہی فائدہ کیوں نہ ہو جائے۔ یہ ہرگز بہادری نہیں، بلکہ معاشرے کا ایک خطرناک مرض ہے، جو سامراج نے امتِ مسلمہ کی نوجوان نسل کو تباہ کرنے ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے خود تخلیق کیا۔

آج سمجھ داری، عقل مندی اور پختہ دینی شعور کے ساتھ پُرعزم جدوجہد پر مبنی حکمتِ عملی ہی بہادری کے ذیل میں آتی ہے۔ اللہ ہم کو عقل و شعور اور شجاعت کے حقیقی جوہر سے نوازے۔ ہمیں ہمت، جرأت اور بہادری عطا کرے۔

www.rahimia.org

عظمت کے مینار

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ

وسیم اعجاز، کراچی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ ۱۲۶۸ھ/ 1851ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ مولانا ذوالفقار علیؒ دارالعلوم دیوبند کی پہلی مجلس شوریٰ کے ممتاز رُکن تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ سے جاملتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجدؒ سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کی غرض سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پاس تشریف لے گئے۔ مولانا نانوتویؒ کا قیام اس وقت میرٹھ میں تھا۔ 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو حضرت شیخ الہندؒ دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم میں داخل ہوگئے۔ یہاں پر مولانا محمودؒ، مولانا محمد یعقوب بن حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ اور سید احمد دہلویؒ سے علوم کی تکمیل کی۔ 1873ء میں تحصیل علوم سے فارغ ہوئے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے یہاں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے علومِ دینی اور سیاست کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور تربیت بھی پائی تھی۔ اب اس تحریک سے وابستہ تمام احباب کی دینی وسیاسی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ان پر تھی۔

1878ء میں اس تحریک کے مجاہدوں کی تعلیم وتربیت، اسے تنظیمی ڈھانچہ دینے اور سیاسی امر کی ادائیگی کی ذمہ داری حضرت شیخ الہندؒ نے سنبھال لی۔ انھوں نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ایما پر فضلائے دارالعلوم کی ایک انجمن ''ثمرۃ التربیت'' کے نام سے قائم کی۔ 1909ء میں جمعیۃ الانصار کا قیام عمل میں آیا۔ 1913ء میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دہلی میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک اجتماعی تربیت کا ادارہ قائم کیا، جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کے مطابق ہندوستان کے معروضی حالات میں سیاسی رہنمائی کرنا تھا۔ حضرت سندھیؒ اس کے ناظم قرار پائے، جب کہ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ اور نواب وقار الملکؒ برابر شریک تھے۔

یوں حضرت شیخ الہندؒ نے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اجتماعی افکار کی روشنی میں ملکی آزادی کی تحریک کا آغاز کیا۔ بہ قول مولانا حسین احمد مدنیؒ: ''مولانا نے تھوڑی مدت میں بہت کچھ کامیابی حاصل کرلی اور کام کرنے والوں کے لیے شاہراہِ عمل قائم کردی۔'' تاریخ آزادی کی اس تحریک کو ''تحریکِ ریشمی رومال'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تحریک کے مندرجہ ذیل اہم ترین مراکز میں دیوبند، رائے پور، دہلی، گوٹھ پیر جھنڈا، دین پور، امروٹ، کراچی، چکوال، ترنگ زئی، یاغستان، کابل، پانی پت، راجستھان اور مدینہ منورہ شامل تھے۔

تحریکِ ریشمی رومال میں حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ عام طور پر حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کے مشوروں پر عمل فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

> ''دونوں حضرات (شیخ الہندؒ اور شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) یک جان ودو قالب ہوگئے اور اخیر تک اسی پر قائم رہے۔ تحریکِ آزادی کی خاطر جب حضرت شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو انھیں کو اپنا قائم مقام بناگئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کردی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کو میرا قائم مقام سمجھنا اور اہم امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا۔''

دونوں اکابرین کی باہمی محبت کا اندازہ حضرت شیخ الہندؒ کے ان اشعار سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو حضرت عالی رائے پوریؒ کے وصال پر انھوں نے تحریر فرمائے۔ یہ اشعار ''مسدسِ مالٹا'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

1915ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز پہنچتے ہی مکہ معظمہ کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی، جو پہلے ہی آپؒ سے واقف تھے۔ آپ نے انھیں ہندوستان کی صحیح صورتِ حال اور اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ غالب پاشا نے ہر طرح سے آپؒ کی امداد اور آپؒ سے تعاون کا یقین دلایا اور اس سلسلے میں آپؒ کو کئی تحریریں دیں۔ ایک تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی، جس میں انھیں ظالم انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اہل ہند کو آزادیٔ کامل پر آمادہ ہوجانا چاہیے اور اپنی جدوجہد کو تیز کردینا چاہیے۔ یہی وہ تحریر ہے جو تاریخ میں ''غالب نامہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ یہ تحریریں لے کر مدینہ منورہ تشریف لائے۔ حسن اتفاق سے غازی انور پاشا اور جمال پاشا بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس طرح ان دونوں ترکی زعما سے آپؒ کی ملاقات مدینہ منورہ ہی میں ہوگئی۔ جمال پاشا آپؒ کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور ملاقات کے بعد آپؒ کی استعمار دشمنی کو یوں خراج تحسین پیش کیا:

> ''اگر محمود حسن کو جلا کر راکھ بھی کردیا جائے تو اس کی راکھ بھی انگریز سے کترا کر گزرے گی۔''

حضرت شیخ الہندؒ نے وہ خطوط مولانا ہادی حسنؒ کے ذریعے ہندوستان اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے ذریعے آزاد قبائل میں پہنچادیے۔ تحریک کی معلومات ریشمی رومال پر تحریر کر کے حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچانے کا بندوبست کیا گیا، لیکن اگست 1916ء میں ان خطوط کا علم انگریز کو ہوگیا۔ آزادی کی اس تحریک کی سربراہی کی پاداش میں فروری 1917ء میں حضرت شیخ الہندؒ کو ان کے ساتھیوں کے ہمراہ جزیرہ مالٹا میں قید کردیا گیا۔ اس زمانے میں ان صبر کے پیکروں نے قوم ووطن کے لیے بڑے مصائب برداشت کیے، تکلیفیں اٹھائیں۔ دورانِ قید حضرت شیخ الہندؒ مستقل بیماریوں میں مبتلا ہوگئے، لیکن آپؒ کی استقامت میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ مالٹا میں آپؒ تقریباً ساڑھے تین سال تک اسیر رہے۔ 15/مارچ 1920ء کو آپؒ کی رہائی کے احکامات جاری ہوئے۔ بمبئی کی بندرگاہ پر ہزارہا آزادی کے متوالوں نے آپؒ کا پُرجوش استقبال کیا اور

www.rahimia.org

خلافت کمیٹی کی جانب سے آپؒ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا اور آپؒ کو 'شیخ الہند' کا خطاب دیا گیا۔

تحریک ریشمی رومال کے بعد حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد تحریک کی حکمتِ عملی میں تبدیلی پیدا کی اور فرمایا کہ: ''آج کا دور تشدد پر مبنی جدوجہد کی بجائے مطالبہ حقوق کا دور ہے۔'' آپؒ نے مذہب کے گروہی اور تقسیم انسانیت پر مبنی نظریے کی نفی کر کے عدم تشدد کی بنیاد پر اسلام کے انسان دوست تصور پر مبنی قومی حکمتِ عملی کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی حکمتِ عملی آغاز سے یہ رہی کہ جدوجہدِ آزادی میں علما کے شانہ بہ شانہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو شامل ہونا چاہیے۔ چناں چہ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، حکیم اجمل خاںؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ اور خان عبدالغفار خانؒ ایسے لوگ آپؒ کی جدوجہد کے ساتھی رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ باوجود سخت علالت اور نقاہت کے 29/اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ بیماری کی بنا پر اَحباب نے روکنا چاہا تو فرمایا کہ: ''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہوں گا۔'' حضرت شیخ الہندؒ اپنے خطبہ میں مزید فرماتے ہیں:

> ''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔''

حضرت شیخ الہندؒ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور تاسیسی اجلاس میں قومی مذہب کے حوالے سے تشکیل پانے والے رویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''بہت سے نیک بندے ہیں، جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا۔''

حضرت شیخ الہندؒ نے موجودہ دور کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> ''اس دور میں ہمارے زوال کے دو اسباب ہیں: ایک قرآن کی انقلابی تعلیمات سے دوری اور دوسرا آپس کے شدید اختلافات۔''

آپؒ کے یہ الفاظ آج بھی ہمیں جدوجہد کی دعوت دیتے ہیں۔

مالٹا سے واپسی کے صرف 6 ماہ بعد یہ عظیم لیڈر اور ہندوستانی قوم کے جلیل القدر قائد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ 30/نومبر 1920ء بروز منگل کو ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ کے مکان پر اللہ کا ذکر کرتے ہوئے اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ولی اللّٰہی تحریک کے اکابرین کے مشن پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

رفتارِ کار

رپورٹ: انیس احمد سجاد ایڈووکیٹ، لاہور

جانشین خانقاہِ سراجیہ کی ادارہ رحیمیہ آمد

مؤرخہ 4/اکتوبر 2016ء کو خانقاہِ سراجیہ کندیاں شریف کے مسند نشین حضرت مولانا خواجہ خلیل احمد مدظلہٗ العالی، خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور شریف کے مسند نشین حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ العالی سے ملاقات کے لیے ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ لاہور میں تشریف لائے۔ حضرت رائے پوری نے ان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ اس کے بعد دونوں حضرات کے درمیان خوش گوار ماحول میں گفتگو ہوتی رہی، جس میں دونوں خانقاہوں کے بزرگوں کے باہمی تعلق اور ربط پر بات چیت رہی کہ ولی اللّٰہی سلسلے کی خانقاہ اور مجددی خانقاہ میں ہمیشہ سے ربط اور تعلق رہا ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ کی باہمی اُلفت، حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور اُن کے شاگرد حضرت شاہ غلام علیؒ کا باہمی تعلق، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ، حضرت شاہ احمد سعیدؒ اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ کا باہمی تعلق، حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا محمد عبداللہ لدھیانویؒ کا تعلق، حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ، حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ اور حضرت خواجہ خان محمدؒ کے درمیان انتہائی قریبی تعلقات اور روابط رہے ہیں۔ ان دونوں سلسلوں کے بزرگان میں شریعت، طریقت اور سیاست کی جامعیت رہی ہے۔

دورانِ گفتگو حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے خواجہ خلیل احمد مدظلہٗ کو اس بات پر مبارک باد پیش کی کہ انھوں نے ''مکتوبات امام ربانیؒ'' کو جدید زبان و پیرائے میں ترجمہ کروا کر خانقاہ کی طرف سے چھاپا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اسلام کے ہزارۂ دوم میں جو تجدیدی کام کیا ہے، اُس پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے اس اہم حقیقت پر گفتگو فرمائی کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ نبی پاکؐ کے وارث وہ علما ہیں، جو کہ علم الاحکام اور علم اسرارِ دین کے حامل ہوں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''علم اسرارِ دین'' پر اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حُجّۃ اللّٰہ البالغہ تحریر فرمائی ہے۔ اسی اہم حقیقت کی طرف امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے زور دیا ہے۔ آج علما کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم اسرارِ دین کی طرف متوجہ ہوں اور اس علم پر مبنی دین کے جامع فلسفہ و فکر کا شعور کے تناظر میں دورِ حاضر کے چیلنجز کو سمجھیں اور اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔

حضرت خواجہ خلیل احمد مدظلہٗ مغرب سے عشا کے درمیان ادارہ رحیمیہ میں تشریف فرما رہے۔ انھوں نے ادارے میں ہونے والی تعلیمی اور تربیتی سرگرمیوں پر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ آخر میں حضرت رائے پوری نے ''سوانح شاہ عبدالرحیم رائے پوری'' سمیت ادارہ کی دیگر مطبوعات کا ایک سیٹ حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

www.rahimia.org

Monthly RAHIMIA Lahore CPL No. 59

بصیرت افروز اقوال — مرتب: حافظ محمد شفیق، لاہور

ارشادات حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری قدس سرہٗ

(حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے درج ذیل ارشادات مطبوعہ عزم سیریز ملتان سے ماخوذ ہیں۔ مرتب)

O اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ آج ہم نے دین و دنیا کی تقسیم کو قبول کر لیا۔ مذہبی طبقے کی دوڑ صرف مسجد تک ہے۔ گویا وہ اجتماعی کام اور سماجی امور سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اور گریجویٹ طبقے کی سوچ یہ ہے کہ میری ملازمت صرف اس لیے ہے کہ مجھے اس سے فائدہ حاصل ہو جائے۔ اس سے غرض نہیں کہ یہ نظام کیا ہے؟

O ہمارا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی، فرقہ پرستی، تنگ نظری اور ایک دوسرے کی قتل و غارت گری ہے، جس سے نفرت اور دوری پیدا ہوئی۔ (ہم) اپنی اولادوں کو نظریۂ آزادی دیں۔ نظریۂ غلامی سے بچائیں۔ انھیں جماعتِ صحابہؓ اور مسلمانوں کی بارہ سو سالہ عروج کی تاریخ بتلائیں۔ آج کی فرقہ واریت اور مذہبی تنگ نظری نہ سکھائیں۔ درست سیاسی، معاشی سوچ دیں۔

O دین کے غلبے کا مقصد مسلمانوں کی گروہی حکومت نہیں، بلکہ عدل و انصاف کی حکومت قائم کرنا ہے۔ ہمیں قرآن کا غلبہ اور عدل و انصاف کا نظام چاہیے۔ اس کے لیے ایسی مضبوط جماعت چاہیے، جس جماعت کے یہ دو اَخلاق ہوں کہ عوام کے لیے رحمت کا جذبہ رکھتی ہو اور ظالم کے مقابلے میں سخت ہو۔

O سیاسی شعور نہ ہونا اور آزادی کا شعور نہ ہونا بہت بڑا عذابِ الٰہی ہے۔ کیوں کہ آزادی جن قوموں کو حاصل ہوتی ہے، وہ قومیں عزت اور خوش حالی حاصل کرتی ہیں۔

O آج ہمیں نظام اور سسٹم کی خرابی کا شعور نہیں۔ پارٹیوں کی نفرت میں ہم کو ڈال دیا گیا کہ کوئی اسلام کے نام پر تقسیم کر رہا ہے، کوئی جمہوریت کے نام پر تقسیم کر رہا ہے اور کوئی پاکستانی نظریے سے تقسیم کر رہا ہے۔ جب کہ سسٹم وہی انگریز کا قائم ہے۔ جاگیردار اور سرمایہ دار سب سسٹم کے آلہ کار ہیں اور سسٹم اسی طرح مضبوط ہوتا رہتا ہے کہ ظلم کرتا رہتا ہے۔

O آج نوجوان کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ اُس کی قومی مسائل میں دلچسپی پیدا ہو۔ اور تعلیمی نظریے سے اس کے اندر جو انفرادیت پیدا ہوئی ہے، وہ ختم ہو۔ جماعتی سوچ موجود ہو۔ اپنے حقوق لینے کا جذبہ پیدا ہو۔ ان میں صلاحیت نمایاں ہو۔

تصحیح

ماہنامہ رحیمیہ اکتوبر 2016ء میں درج ذیل تصحیح فرمالیں: (1) مضمون ''اسلامی جمہوریہ اور اسلامک بینک'' میں ''اس شعبے کا عالمی حجم 200 کھرب ڈالر'' کی بجائے ''اس شعبے کا عالمی حجم 20 کھرب ڈالر'' ہے۔ (2) ''بصیرت افروز'' کالم میں ''مطبوعہ سہ ماہی شعور و آگہی لاہور'' کی جگہ ''عزم سیریز ملتان'' پڑھا جائے۔

دینی مسائل

اس صفحے پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں!

از حضرت مفتی عبدالقدیر شعبۂ دارالافتا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال ہم تین بھائیوں محمد حنیف، محمد رفیق اور محمد ادریس کا ایک پلاٹ کی ملکیت پر اختلاف ہے۔ یہ پلاٹ سرکاری کاغذات میں ہم تینوں بھائیوں کے نام ہے۔ یہ اُس وقت خریدا گیا، جب ہمارے والد جان محمد حیات تھے۔ وہ بیماری کے سبب کام نہیں کر سکتے تھے۔ بڑے بھائی محمد حنیف کی نگرانی میں ہمارے گھر کا مشترکہ خاندانی نظام چل رہا تھا۔ اُسی کے مطابق چھوٹے بھائی محمد ادریس کو مشترکہ آمدن سے ہی بیرونِ ملک کام کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اُس کی بھجوائی ہوئی رقم سے 1986ء میں یہ پلاٹ خریدا گیا۔ اُسی نے اسے مشترکہ طور پر تینوں بھائیوں کے نام کرا دیا۔ 2004ء میں والد کے انتقال کے بعد مشترکہ خاندانی نظام ختم ہوا اور سب الگ الگ ہو گئے۔ اب محمد حنیف اور محمد رفیق اسے مشترکہ خاندانی اثاثہ سمجھتے ہوئے اس پلاٹ میں سے اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔ جب کہ محمد ادریس کا کہنا ہے کہ چوں کہ یہ پلاٹ میری رقم سے خریدا گیا، اس لیے یہ صرف میرا ہے۔ اس پلاٹ کی ملکیت کی شرعی حیثیت بتلائی جائے۔

سائلین: محمد حنیف، محمد رفیق، محمد ادریس۔ میاں چنوں

جواب صورتِ مسئولہ میں متنازع پلاٹ کے حوالے سے تینوں بھائیوں کے بیانات تحریری طور پر لیے گئے۔ نیز ریونیو ریکارڈ پر مشتمل سرکاری کاغذات بھی ملاحظہ کیے گئے۔ ان کی بنیاد پر جو اُمور معلوم ہوئے، وہ درج ذیل ہیں:

1۔ پلاٹ کی خریداری کے وقت والدین کی سرپرستی میں خاندان کا نظام مشترکہ تھا۔ والد صاحب کی نمائندگی بڑا بھائی محمد حنیف کر رہا تھا۔

2۔ خاندانی معاملات مثلاً شادیاں، گھروں کے ضروری اخراجات، مشترکہ طور پر بڑے بھائی ہی کی زیرِ نگرانی سرانجام پاتے تھے۔

3۔ پلاٹ کی خریداری والدین کی موجودگی میں ہوئی اور مشترکہ طور پر تینوں کے نام ہوا۔

4۔ نیز لین دین کے معاملات میں کسی ایک یا سب کی طرف سے آپس میں کوئی معاہدۂ قرض یا شرکت وغیرہ نہ کیا گیا۔ نہ تحریری طور پر اور نہ زبانی طور پر۔

لہٰذا ایسی صورت میں یہ پلاٹ والدین کے دیگر ترکہ کی طرح تینوں بھائیوں کی مشترکہ ملکیت میں شمار ہوگا اور برابر تقسیم کیا جائے گا۔ فتاویٰ شامی میں لکھا ہے کہ ''**لو اجتمع اخوة يعملون في تركة ابيهم و نما المال فهو بينهم سويّة، و لو اختلفوا في العمل و الرّأى.**'' (فتاویٰ شامی، ج:6، ص:497) (یعنی بہت سے بھائی اگر اپنے والد کے مال میں مل کر کام کر رہے ہوں اور مال میں اضافہ ہو جائے تو یہ ان میں برابر تقسیم ہوگا۔ اگرچہ وہ اپنی رائے سے مختلف طرح کے کام ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔)

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''رحیمیہ'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے جاری کیا۔